منفصل دنیائیں

فل ریز ☆

فرانس کے شہر لیون کی نواحی بستی میں، میں نے جب گزشتہ موسم سرما کے ایک اتوار کی سہ پہر کو بی بی سی۔ ۲ سیریز بہ عنوان ''سیارہ اسلام'' کے سلسلے میں فلم بنانا شروع کی تو وہاں کے لوگوں نے شدید معاندانہ ردعمل کا اظہار کیا۔ اس سیریز کا مقصد دراصل ان مقامات پر مذہب کی ترقی کا جائزہ لینا ہے، جہاں اس کی روایتی طور پر جڑیں نہیں ہیں۔ اس سلسلے کا پہلا پروگرام فرانس کے بارے میں ہے جہاں اسلام کو فرانسیسی طرز زندگی کے لیے ایک ثقافتی خطرہ سمجھا جاتا ہے۔ اس طرز عمل کا ایک سبب یہ تھا کہ دو سال بیشتر ''خالد کیلکال'' نامی ایک الجزائری نوجوان کو دہشت گرد قرار دے کر ہلاک کر دیا گیا تھا اور اس کارروائی کو ٹیلی ویژن پر بھی دکھایا گیا تھا۔ مسلمانوں کا خیال تھا کہ اس کو محض غیر فرانسیسی ہونے کی بنا پر اذیت پسندانہ موت کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ اس کے نتیجے میں فرانسیسی مسلمانوں نے میڈیا پر اعتبار کرنا چھوڑ دیا۔ میں نے میڈیا کے بارے میں اس طرح کا طرز عمل افریقن امریکی مسلمانوں میں دیکھا۔ برطانیہ میں صورت حال نسبتاً بہتر ہے۔ لیکن ''اسلام فوبیا'' یعنی اسلام سے خوفزدگی کے مرض کے موضوع پر ایک مشاورتی مضمون میں رنی میڈ ٹرسٹ نے برطانوی میڈیا پر تعصب پھیلانے کا الزام لگاتے ہوئے بتایا ہے کہ سنسنی خیزی پھیلانے والے اخبارات کس طرح اسلام کو قابل نفرت صورت میں پیش کرتے ہیں اور برطانوی پریس میں اسلام کو عموماً حقارت آمیز حوالوں سے متعارف کرواتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ میڈیا کا اثر ہوتا ہے۔ اخبارات ایسی باتوں کو خوب اچھالتے ہیں جن سے اسلام کی بدنامی ہوتی ہے۔ وہ کبھی مسلمانوں کو جنونی ظاہر کرتے ہیں اور کبھی انہیں دہشت گرد قرار دیتے ہیں۔ غرض وہ کوئی ایسا موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے جس سے وہ یہ ظاہر کر سکیں کہ مسلمان مغربی تہذیب کے لیے خطرے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں وہ بعض اہم بین الاقوامی واقعات مثلاً ۱۹۷۰ء کے عشرے میں پی ایل او اور

☆ Phil Rees, "Worlds apart", *News Statesman*, August 1, 1997. pp 24-56
(تلخیص: ڈاکٹر رحیم بخش شاہین)

بلیک ستمبر کے حملے اور اس کے بعد کے عشرے میں برپا ہونے والے ایرانی انقلاب کا حوالہ دیتے ہیں۔ لیکن یہ واقعات زیادہ تر اسرائیل یا لبنان کے لیے مخصوص ہیں اور اسلام کے حوالے سے ان کی کوئی خاص اہمیت نہیں بنتی۔ مسلمان اچھے بھی ہو سکتے ہیں اور برے بھی۔ یاد رہے کہ ۱۹۸۰ء کے عشرے کے آغاز میں افغان مجاہدین کو رومانی ہیروز کے طور پر پیش کیا جاتا تھا۔ جو اپنے ملک کو اشتراکیت سے نجات دلانے کے لیے مصروف جنگ تھے۔ لیکن سوویت یونین کی تباہی کے بعد اس طرح کے سوالات سامنے آنے لگے کہ نیا عالمی نظام کیا ہے ؟ کیا مابعد اشتراکیت سرمایہ دارانہ نظام کی ترویج کی راہ میں کوئی چیلنج پیش آئے گا ؟ اگر اس کا جواب اثبات میں ہے تو سوال یہ ہے کہ چیلنج کہاں سے نمودار ہو گا ؟

ان سوالات کے جواب میں ایک نیا تصور سامنے آیا کہ کیوں نہ سوویت خطرے کی جگہ اسلامی خطرے کو نمایاں کیا جائے۔ صلیبی جنگوں کے حوالے اس ''خطرے'' کو باآسانی تسلیم کر لیا جائے گا۔ اور ایسا ہی ہوا۔ مغرب میں عام ذہنوں پر جنونی مسلمانوں کا تصور غالب آگیا۔ ہاورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر سیموئیل ہنٹنگٹن نے اپنی کتاب ''تہذیبوں کا تصادم'' میں اس تصور کو مزید اجاگر کیا۔ صحافیوں نے اس کتاب میں پیش کردہ خیالات کو سادہ و سہل انداز میں پیش کیا۔ نتیجہ یہ کہ اس زمانے کے نیٹو کے سیکرٹری جنرل ولی کلائیز نے جنگجو اسلام کو ''مغرب کی سلامتی کے لیے سب سے بڑا خطرہ'' قرار دیا۔

میں نے گزشتہ دس سالوں کا اکثر حصہ افریقہ میں جنگجو اسلام پر فلمیں بناتے ہوئے گزارا اور مجھے یقین ہے کہ صحافیوں میں ہنٹنگٹن کا نظریہ بہت زیادہ مقبولیت اختیار کر گیا ہے اور اس کو سمجھنے اور ماننے میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوتی۔ اس نظریے کے دو نتیجے سامنے آتے ہیں۔ ایک تو اس حیرت انگیز سوال کی صورت میں جس کا جواب چند ایک صحافیوں نے دینے کی کوشش کی ہے کہ آخر ۱۹۶۰ء کے عشرے سے عموماً اسلام اور خصوصاً جنگجو اسلام کی توسیع کیوں ہوئی ہے ؟ اور دوسرا یہ کہ پہلے اشتراکیت مغرب کے لیے بیرونی خطرہ تھا اور اب اسے اسلام کی صورت میں ایک اندرونی خطرہ درپیش ہے اور مغربی ممالک میں آباد مسلمان اس امر سے بخوبی آگاہ ہیں۔

روایات، وابستگی اور تعبیر و تشریح کے اعتبار سے عیسائیت کی طرح اسلام میں بھی تنوع ہے۔ بعض مبصرین نے ''اچھے اعتدال پسند مسلمانوں'' اور ''بنیاد پرستوں'' یا ''جنونیوں'' میں امتیاز کیا ہے۔ لیکن اس سے ایک زیادہ اہم فرق اوجھل ہو جاتا ہے جو یہ بھی واضح کرتا ہے کہ ''بنیاد پرستی'' کو فروغ کس طرح ملا ؟ اور یہ بھی بتاتا ہے کہ ان لوگوں کے مقاصد کیا ہیں جو

اسلام کو ایک خطرہ کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ یہ امتیاز ان گروہوں اور حکومتوں کے درمیان کیا جاتا ہے جو مغربی مفادات کی حمایت کرتی ہیں، خصوصاً وہ جو کہ تیل تک مغرب کی محفوظ رسائی کو برقرار رکھتی ہیں اور وہ جو مغرب کی اس معاشی ضرورت کے لیے خطرے کی حیثیت رکھتی ہیں۔

اسلامی جنگجو پسندی کے بارے میں مغربی حکومتوں کی تشویش کے اظہار کے نتیجے میں خود مختار مسلمان ریاستیں مغرب کے لیے معتبر قابل استفادہ ریاستیں بن جاتی ہیں جیسا کہ سعودی عرب ہے۔ اسلامی ریاستیں اس وقت تک مغرب کے ساتھ مثبت روابط کی راہ میں حقیقی رکاوٹ متصور نہیں ہوتیں جب تک ان کا حکمران طبقہ مغرب کے مفادات کی تکمیل کرتا رہتا ہے۔

سیاسی اسلام دہشت گردی کے مماثل سمجھا جاتا ہے۔ اگرچہ ہندوستان اور انڈونیشیا سب سے زیادہ مسلم آبادی والے ملک ہیں، لیکن سب سے زیادہ تشدد اور دہشت گردی مشرق وسطیٰ میں ہو رہی ہے۔ مغربی مفادات کے تحفظ کے حوالے سے عام ذہن ''بنیاد پرستی کو محدود رکھنے کی ضرورت'' اور ''اسلامی دہشت گردی کا مقابلہ کرنے کی ضرورت'' کے حوالے سے غور کرتا ہے اور حزب اللہ کی طرح کے گروہوں کو جو جنوبی لبنان کو اسرائیلی قبضے سے واگزار کرانے کے لیے مصروف جنگ ہیں، معمول کے مطابق دہشت گرد قرار دیا جاتا ہے۔ حالانکہ حزب اللہ کی دہشت گردی سے جتنے اسرائیلی شہری ہلاک ہوتے ہیں ان سے کہیں زیادہ تعداد میں مسلمان اسرائیلی ہوائی حملوں اور توپوں کی گولہ باری سے ہلاک ہو چکے ہیں۔

صدر کلنٹن جب ایران کو ایک دہشت گرد ریاست قرار دیتے ہیں تو بین الاقوامی میڈیا اس خبر کو گویا اچک کر آناً فاناً ساری دنیا میں پھیلا دیتا ہے۔ لیکن وہی کلنٹن جب ہیلری کے ساتھ اپنی زندگی بھر کی وفاداری کا اعلان کرتے ہیں تو بہت تھوڑے صحافی ان کے بیان کو قبول کرنے پر آمادہ ہوتے ہیں۔ اسی طرح الجزائر کے انتہا پسند مسلمانوں کے بارے میں کوئی افسوس ناک خبر مل جائے جو مبینہ طور پر بچوں اور عورتوں کے گلے کاٹتے ہیں تو ایسی خبریں نمایاں طور پر شائع کی جاتی ہیں۔ الجزائر کے مسلح مسلمان یقیناً بہت بے رحم ہیں لیکن خیال رہے کہ وہ ایک ایسی حکومت کے خلاف جنگ کر رہے ہیں جو خود ہزاروں کی تعداد میں ماورائے عدالت ہلاکتوں کی ذمہ دار ہے۔ ۱۹۹۲ء میں مسلمان جماعت ''اسلامی محاذ آزادی'' نے قومی انتخابات میں کامیابی حاصل کی لیکن فوج نے مغرب کی خاموش رضامندی کے ساتھ ان انتخابات کو منسوخ کر کے اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ اس وقت سے الجزائری حکومت نے مصری

صدر مبارک کی طرح خطرے سے محفوظ جمہوریت کو اپنا رکھا ہے۔

جب یورپ کے بائیں بازو کے سیاسی گروہ کو مصر میں اخوان المسلمون کے خلاف ہونے والی بنیادی حقوق کی خلاف ورزیوں یا الجزائر میں جمہوریت کے مذاق کے بارے میں خبریں ملتی ہیں تو اس کے لبوں پر مہر سکوت لگ جاتی ہے۔ بائیں بازو کو جنگجو اسلام کے اسباب و محرکات سے کوئی غرض نہیں ہوتی۔ وہ بھی مغربی مفادات کو لاحق خطرے کے حوالے سے طرز فکر و عمل اختیار کرتا ہے۔ یا پھر اسے ان باتوں کی فکر ہوتی ہے جن کا تعلق عورتوں کے حقوق اور آزادی قلم کے بارے میں اسلام کے جابرانہ طرز عمل سے ہے۔ اہم ترین بات یہ ہے کہ بائیں بازو نے ان وجوہ کو نظر انداز کر دیا ہے جن کی بنا پر مسلمانوں نے ساری دنیا میں اپنا اسلامی تشخص اجاگر کیا ہے۔ اسلام نے اپنی جدید سیاسی صورت استعمار کے رد عمل میں اپنائی تھی اس کے باوجود جو لوگ عام حالات میں استعمار کے خلاف جدوجہد کو بہ نگاہ تحسین دیکھتے ہیں وہ بھی اسلام سے متاثر نہیں ہوتے بلکہ اس کو نظر انداز کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ممکن ہے کہ اس بے توجہی کا باعث یہ ہو کہ راسخ مارکسی ہر قسم کے مذہب کو پسماندگی اور سیاسی غلبہ و تفوق کا ذریعہ سمجھتے ہوئے رد کرتے ہیں لیکن جب ہم نظریاتی طور پر دنیا کا جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ مذہبی سیاسی تحریکیں دائیں بازو سے بھی تعلق رکھتی ہیں اور بائیں بازو سے بھی۔ یا البتہ ان کو اس طرح جانچا جاسکتا ہے کہ آیا وہ طبقاتی امتیاز اور ظلم و ستم کو چیلنج کرتی ہیں یا نہیں؟

جنگجو اسلام کا آغاز ۱۹۶۰ء کے عشرے میں ہوا اور اس نے اس زمانے میں عدل اجتماعی کو اپنا مرکزی نصب العین قرار دیا۔ اس وقت سے لے کر اب تک یہ عرب دنیا میں ایک معتبر احتجاج کی حیثیت سے معروف ہے اور اسے افلاس زدہ لوگوں کے سوشلزم کے نعرے کا متبادل سمجھا جاتا ہے۔ اس شکل میں اسلام ایک آزاد دین کی حیثیت سے اسی طرح مقبول ہے جس طرح ۱۹۸۰ء کے عشرے میں وسطی اور جنوبی امریکی میں کیتھولک مسلک تھا۔

جنگجو اسلام سیکولر قومی ریاست کی ناکامی کا رد عمل بھی ہے۔ اس طرح کی ریاستیں استعماری حکمرانوں نے عرب دنیا میں تخلیق کیں۔ ۱۹۶۷ء میں اسرائیل نے عربوں کو شکست دی۔ اس وقت سے قومی ریاست، قومی شناخت کا شعور پیدا کرنے یا مضبوط اور خوشحال معاشروں کو تشکیل دینے میں ناکام رہی ہے، اس کے برعکس اسلام زیادہ کارآمد ثابت ہوا ہے۔

ان حقائق کے باوجود ہماری روش معاندانہ رہتی ہے۔ گزشتہ سال جب کابل میں طالبان نے اقتدار حاصل کیا تو اس صورت حال کو تہذیبوں کے تصادم کے حوالے سے دیکھا گیا۔ قطع

نظر اس کے کہ امریکہ نے بالواسطہ طور پر طالبان کی حمایت کی تھی۔ (اور یہ کہ طالبان کے شدید ترین نقادوں میں سے ایک ایران بھی ہے) طالبان کو بدنام کرنے کے لیے مسلمان عورتوں کو سر سے لے کر پاؤں تک برقعے میں ملبوس دکھایا گیا۔

طالبان دراصل جنوبی اور مشرقی افغانستان کے روایتی غرمت زدہ پشتون کاشت کاروں کی نمائندگی کرتے ہیں جو نہ تو آزاد خیال ہیں اور نہ نرم مزاج، بلکہ اکھڑ پن ان کی خصوصیت ہے۔ وہ اس قبائلی طرز زندگی کی نمائندگی کرتے ہیں جو افغانستان میں صدیوں سے موجود رہا ہے۔ برقعہ کی شکل قرآن مجید سے ماخوذ نہیں ہے لیکن یہ وسطی ایشیا کی ثقافتوں میں رائج رہا ہے، اس کے باوجود آزاد خیال بائیں بازو کی تعبیر یہ تھی کہ برقعہ دراصل عورتوں کے بارے میں طالبان کے جبری رویے کا غماز ہے۔ یہ انداز نظر اس سے بہت مختلف ہے جو ہم افریقہ یا ایمزون کی قدیم ثقافتوں کے متعلق اختیار کرتے ہیں۔ میں نے ایران سے لے کر امریکہ تک درجنوں برسرکار خواتین سے گفتگو کی ہے۔ انہیں یقین ہے کہ اسلام ماں کی حیثیت سے انہیں بے حد عزت اور احترام عطا کرتا ہے، انہیں کاروبار یا ملازمت کی اجازت دیتا ہے اور آرائش و زیبائش کے بارے میں تشویش کا اظہار نہیں کرتا۔

امریکہ میں عورتوں کی مساوات قانونی اعتبار سے عروج پر ہے لیکن وہاں بھی اسلام افریقن امریکی عورتوں میں تیزی سے پھیل رہا ہے۔ انڈونیشیا میں میری بہت سی عورتوں سے ملاقات ہوئی۔ وہ اسلام پر فخر کرتی ہیں اور اس بات کی معترف ہیں کہ اسلام نے انہیں اختیار بخشا ہے اور اپنی زندگی کی تعمیر کی مکمل اجازت دی ہے۔ مسلمان خواتین کو یقین ہے کہ اسلام سیاہ فام عورتوں کو منشیات اور بدکاری سے محفوظ رکھتا ہے اور انہیں وہ عزت بخشتا ہے جو انہیں عام طور پر سفید فام امریکی معاشرے میں نہیں ملتی۔

بائیں بازو کے لوگ روایت پسند نہیں ہوتے لیکن مسلمانوں کے معاملے میں وہ دوسرے لوگوں سے مختلف نہیں ہیں اور ترک وطن کے مسئلہ اور ثقافتی اختلاف سے اسی طرح خوف زدہ ہیں جس طرح ان کے دیگر ہم وطن ہیں۔ فرانس کے بائیں بازو کے لوگ عام طور پر نسل پرستی اور انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کے بارے میں بہت حساس ہیں لیکن فرانسیسی جیلوں میں مسلمانوں کی خستہ حالت پر وہ گونگے بن گئے ہیں۔ ''فرانسیسی قومی محاذ'' نے اسلام کے غلبہ و تفوق کے اندیشے کو ہوا دے کر بہت فائدہ اٹھایا ہے۔ لطف یہ ہے کہ بائیں بازو نے اس مغالطے کو دور کرنے کے لیے کچھ نہیں کیا۔

جدید مسلمان معاشروں میں خصوصاً عرب معاشروں میں شناخت کا ایک بحران پیدا ہو

رہا ہے۔ اسلام ایک تاریخی تبدیلی کے دور سے گزر رہا ہے۔ جس میں مسلمان قومیں یہ جاننے کی کوشش کر رہی ہیں کہ وہ ایک ایسی دنیا میں کس طرح گزارا کریں گی جو ان کی قدروں کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں۔ اکثر مسلمان قومیں اس قوت سے اپنے آپ کو غیر محفوظ خیال کرتی ہیں جو انہیں ہر طرف غالب ہوتی ہوئی دے رہی ہے اور یہ قوت دراصل ہالی وڈ کلچر ہے جو جنس پرستی، تشدد اور صارفین کے مطالبوں کو پورا کرنے کی روش سے عبارت ہے۔

اس وقت تہذیبوں کے تصادم کے نظریے کو فوری طور پر رد کرنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ اگر ہم نے اسلام کو دہشت گردی یا عدم رواداری کے حوالے سے جاننے کی کوشش کی تو ہمیں اس کے نتائج کو براہ راست بھگتنا پڑے گا۔ اس وقت یورپ میں ایک کروڑ سے زیادہ مسلمان آباد ہیں اور ہم چاہیں یا نہ چاہیں انہیں یہاں رہنا ہے۔ خالد کیلگال، لیون کے گردونواح میں پروان چڑھا اور اس اعتبار سے وہ فرانس کا شہری تھا۔ اس کے باوجود جس علاقے میں اس نے پرورش پائی اس کے لیے اپنے آپ کو اتنا اجنبی محسوس کیا کہ وہ اپنے ملک کو ہم سے اڑانے پر آمادہ ہو گیا۔

جیسا کہ رنی میڈ ٹرسٹ رقمطراز ہے ''اسلام فوبک'' عہد جدید برطانیہ میں روزمرہ کی زندگی کا حصہ ہے بالکل اسی طرح جس طرح اس صدی میں قبل ازیں صد سامی عہد ہوتی رہی ہے۔ جو لوگ اس کا توڑ کرنا یا اثر کم کرنا چاہتے ہیں اپنے ذہن میں اس طرح کی مماثلتیں رکھتے ہیں۔